(۳)

ایک صدمۂ جانکاہ کا سامنا کر کے دل تمام ہی رہے تھے کہ مزید ایک خبرِ غم اثر نے روح کے دروازے پر دستک دی۔ سارا قصر احساس لرز اٹھا۔[1]

ماہر القادری ایڈیٹر فاران ہم سے جدا ہو گئے! ایک چمکتا ستارہ آسمانِ ایمان و ادب سے اور ٹوٹ گرا۔ خانۂ ظلمت میں گھی کے چراغ جلے ہوں تو کیا عجب!

سفر پر نکلنے سے پہلے دو ایک بار ٹیلی فون پر میرے بارے میں بالواسطہ طور سے معلوم کیا کہ آیا مجھے بھی چلنا ہے یا نہیں۔ میری طرف سے انہیں شاید میرا جواب مل گیا ہو کہ مجھے تو طلب ہی نہیں کیا گیا۔ دل میں سوچا کہ اپنی شعر و شاعری بھی کیا، اور ہو بھی تو اپنے جذبہ و تخیل کے حباب مشاعروں کے تیز و تند طوفانوں میں کیا جگہ پائیں گے۔ وہاں تو صدفِ فن کے گوہر مقام پاتے ہیں، یا پھر چٹانوں اور پتھروں کو وزن ملتا ہے کیونکہ وہ گرم و سرد اور موافق و مخالف رووں سے بے نیاز جہاں کے تہاں جمے رہتے ہیں۔

دو ماہ پہلے انہیں انگلینڈ سے برمنگھم کی سیرت کانفرنس (۲۷ تا ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء) کے لیے دعوت نامہ شرکت ملا تھا۔ ماہر صاحب سفر اور سیر کا شوقِ فراواں رکھتے تھے۔ دعوت کو دل سے قبول کر کے وہ خوش خوش اپنے کام تیزی سے نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔ ماہ رواں کے علاوہ فاران کے مزید دو شماروں کے لیے مضامین جمع کر کے انہیں مرتب کر دیا۔ اسی دوران میں جدہ سے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا۔ خط میں لکھا کہ جدہ جا رہا ہوں، عمرہ و زیارات میں کچھ دن صرف کروں گا اور پھر اگر انگلستان سے ٹکٹ موصول ہو گیا تو آگے چلا جاؤں گا۔ مگر انہیں کسی اور ہی طرف آگے جانا تھا۔ وہ سمندر پار جانے کے بجائے حیاتِ ارضی کی سرحد کے اُس پار چلے گئے۔ اُدھر سے دعوت نامہ اور ٹکٹ پہلے آ گیا ؎

جدہ گئے، پھر آگے بہ صحنِ حرم گئے پھر اور آگے نکلے تو سوئے ارم گئے

---

[1] اشارات کے جملہ صفحات کتابت ہو کر پریس جا رہے تھے کہ ماہر صاحب کی اچانک وفات کی اطلاع موصول ہوئی۔ دل کے تاثر نے مجبور کیا اور فوری طور پر یہ چند سطور مرحوم کے متعلق لکھی گئیں۔ اشارات کا پورا نقشہ بدل دیا گیا ہے۔ (ت۔ص)

حلقۂ یاراں میں ماہر صاحب کی قد آور شخصیت کو بے حد مرکزی مقام حاصل تھا۔ وہ نہ صرف اوّل درجے کے شاعر تھے اور فن اور زبان و محاورہ کے راز داں، بلکہ مادّہ پرستانہ دَور نے لامقصدی ادب اور بدن پرست ادب کے جو محاذ پیدا کر دیے تھے اُن کے خلاف جہاد آرا رہے۔ اس دَور کے مزاج میں ہر روایت میں اندھا دھند بغاوت، ماضی کے خلاف نفرت، اصولوں، ضابطوں اور قدروں کو توڑنے کے لیے ایک نفسیاتی ہیجانی کیفیت کی جو بدبلا پائی جاتی ہے، وہ ایک طرف دین و اخلاق کی بنیادوں کو متزلزل کرتی رہتی ہے۔ اور دوسری طرف تہذیبی اور لسانی معیاریت کو تباہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ماہر صاحب بھی دوہرا کام کرتے رہے دین و اخلاق کے تحفظ کا جہاد بھی جاری رکھا، اور زبان کو بگاڑنے اور فن کو خراب کرنے کی مہمات کے خلاف بھی بڑی جرأت سے معرکہ آرا رہے۔ دراصل وہ ایک ہی کام تھا جسے وہ دو محاذوں سے انجام دے رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے ہماری ادبی سرگرمیوں کا بڑا بھرم قائم تھا۔

دین کے تقاضوں سے حق کہنے میں بے باکی کی وہ ایک روشن مثال تھے۔ پاکستان میں کیسے کیسے مرد افگن دَور گذرے ہیں، مگر ماہر صاحب کا قلم غلام محمد اور سکندر مرزا کے دَور سے لے کر بھٹو صاحب کے زمانے تک سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق بڑی سلیس زبان میں کہتے چلے گئے اور بارہا حکومتوں کے اُٹھائے ہوئے انحرافی مباحث میں تحقیقی مضامین لکھے اور لکھوائے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کی کوئی ایسی کتاب سامنے آئی جس میں دین کی کسی حقیقت کو مسخ کیا گیا ہو، یا بیجا طور پر حکومت کی خوشامد کے جذبے سے مسائل کو تاویل کے سانچے میں ڈھالا گیا ہو، یا فرقہ وارانہ نزاعات کی گھٹیا سطح پر کوئی نکتہ آرائی کی گئی ہو تو وہ ایک ایک پیرے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کی چیر پھاڑ کر کے چھوٹے سے چھوٹے اجزائے فکر و بیان کو اس طرح نمایاں کر دیتے کہ جیسے کسی محدب شیشے کی مدد سے جراثیم اور وائرس کو بڑا کر کے دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔

ماہر صاحب محض ایک ادبی دانشور ہی نہ تھے، بلکہ وہ تحقیق و مطالعہ کے ساتھ اقامتِ نظامِ حق کے لیے پیش آمدہ مسائل پر مؤثر کلام کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی دستور، اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اسلامی تعلیم اور اسلامی حکومت کے لیے ملک میں جو تحریک اوائلِ قیامِ پاکستان سے چل رہی ہے اس میں ماہر صاحب کا بھرپور حصہ شامل ہے۔ یقیناً اُن کی یہ خدمت خدا کے ہاں وزن و قدر رکھتی ہے۔

ماہر صاحب جوانی میں مسیح بنارسی جیسی نظمیں لکھنے کے باوجود دل کے مسلمان تھے۔ اور نعت گوئی کی طرف طبعاً اُن کو رغبت تھی۔ ۱۹۵۴ء میں زیارتِ حرمین سے بہرہ مند ہوئے تو اُن کے اندر حمیتِ دین اور محبتِ رسولؐ

کے جذبات کو خاص نشو و نما ملی۔ اس سفر کی کیفیات کا اظہار انہوں نے "کاروانِ حجاز" میں کیا ہے۔ بعد میں یہ رنگ اُن کے ہاں روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اُن کے یہی مقدس جذبات اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے قبول ہوئے کہ بیماری کے کسی لمبے چکر میں پڑے بغیر اپنے قدموں سے چل کر جانِ جانِ آفرین کو سپرد کرنے کے لیے سرزمینِ حجاز میں پہنچے۔ مشاعرہ پڑھنے گئے تھے مگر وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ جنازہ پڑھے جانے کا مقام بیت اللہ شریف تھا تو اس کا وقت نمازِ جمعہ کے بعد مقرر ہوا۔ تدفین مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں ہوئی۔ علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اس شخص کو کیا مقام ملا۔

ہم اپنے نقصان کو دیکھ کر روتے ہیں، مگر جس کے ہاتھ میں زندگی و موت کا فیصلہ ہے، اس کی نگاہ خیرِ کُل پر ہے اور خیرِ کُل ہی کے لیے اس کے کچھ قوانین اور سنن ہیں اور ہر جان کی اجل مسمّٰی ہے۔ ہم اُس کے سامنے پورے ایمان و اعتماد کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور اپنے لیے مقامِ صبر و رضا چاہتے ہیں۔

ماہر صاحب باغ و بہار شخصیت تھے، بذلہ سنج، لطیفہ گو، نکتہ طراز، اپنی خاص طرزِ ترنم کے موجد، مشاعروں کے بادشاہ، خندہ جبین، احباب نواز، وسیع الروابط، رونقِ مجالس، علم سے بہرہ مند، مطالعہ کے خوگر، شائستہ اطوار، خطوط کا جواب دینے میں نہایت باقاعدہ، لباس اور رہن سہن میں سادگی پسند، غرور سے خالی، بعض معاملات میں بچوں کی طرح بھولے بھالے، اپنی بے اولادی کے تذکرے سے انتہائی مجتنب، اہلیہ کی وفات کے بعد خدمتِ دین و شعر میں پہلے سے زیادہ سرگرم، مرحوم کی کیا کیا خوبیاں عجلت میں لکھے ہوئے اس مختصر نوٹ میں بیان ہوں۔

ذاتی طور پر مجھے ان کا خاص التفات حاصل رہا، اور میری کوتاہیوں اور غفلتوں کے باوجود اُن کی برادر نوازی میں فرق نہیں آیا۔

موجودہ شخصیتوں میں سے سب سے زیادہ محبت و احترام ان کے دل میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی موصوف سے اثر پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں وہ فلمی دائرے میں گیت لکھنے (۱۹۴۲ء) کے تجربے میں پڑے۔ اسی زمانے میں اس کام سے ان کے اندر الجھن پیدا ہوئی۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے خط و کتابت کی۔ اُن کے ایک خط کا یہ حصہ مجھے اب تک یاد ہے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اوسطاً دو ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو رہی ہے۔ اس خط کا جواب اغلباً مولانائے محترم نے میرے ہی ذریعے لکھوا کر بھجوایا تھا۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں فلمی کام چھوڑ دیا، بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلامی

مقاصد کو فن کی رُوح بنانے کا آغاز کر دیا۔ نئے دورِ شاعری میں ان کی ایک عام فہم مگر حقیقت کا عکس پیش کرنے والی نظم قرآن کی فریاد بہت مقبول ہوئی۔ بعد میں اسلامی دستور پر لکھی ہوئی ایک نظم جگہ جگہ مجالس میں پڑھ کر سُنائی جاتی رہی ہے۔

اپنی منزل، اپنا مقصد اسلامی دستور

اِسی طرح جب سکندر مرزا کا مارشل لا لگا اور جماعت خلاف قانون قرار پائی تو پیرایۂ غزل میں انہوں نے مارشل لا کے آسیبی سائے میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ابتلا کو بڑی خوبی سے بیان کیا ؎

شکوۂ آسماں کرتے کرتے رک گیا ہوں فغاں کرتے کرتے
عمر گذری ہے بادِ صبا کی خدمتِ گلستاں کرتے کرتے
ہو نہ جاؤں بہاروں سے بھی بدگماں اعتبارِ خزاں کرتے کرتے

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر سیاسی اور دینی دائروں سے جو حملے ہوتے رہے تھے، ان سب کا جواب دینے کے لیے قلم کو نیزے میں بدل لیتے۔ اور اُس کی نوک سے مخالفانہ مواد کا ایسا ناقدانہ تجزیہ کرتے کہ لفظ لفظ بے جان ہو کے رہ جاتا۔ اسی کے ساتھ جب کوئی مقام ایسا ہوتا کہ مولانا کی کسی بات سے، خواہ وہ تفسیر اور فقہ سے متعلق ہو، یا زبان اور محاورے کے بارے میں، اختلاف ہوتا تو بے محابا اس کا اظہار کرتے، خط لکھتے، ملاقاتوں میں گفتگو کرتے، کبھی ان کے مخلصانہ دلائل سے مولانا متاثر ہو کر اپنی بات میں کوئی تبدیلی کر لیتے، اور کبھی ماہر صاحب کو قائل ہونا پڑتا۔ اور کبھی اختلاف اپنی جگہ برقرار رہتا۔ یعنی انتہائی محبت و احترام کے باوجود معاملہ اندھی عقیدت کا نہ تھا۔ مولانا مودودی نے ایسے ہی آدمی بنانے میں عمر کھپائی ہے۔ محبت کے باوجود اختلاف، اور اختلاف کے باوجود محبت و اتحاد۔

یہ شخصیت جس کی ولادت کیسر ضلع بلند شہر یو پی میں ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء (۱۳۲۴ھ) کو ہوئی اور جس کا تاریخی نام منظور حسین رکھا گیا، ۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو تین بجے شب ہم سے جدا ہو گئی، اگلے دن نماز جمعہ کے ساتھ حرم شریف میں جنازہ پڑھا گیا اور مکہ کے جنت المعلیٰ نامی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن!

رب غفور و ودود، ہمارے اس بزرگ و محب رفیق کی رُوح کو اپنی خاص رحمتوں سے مالا مال کرے۔ آمین